© rasailojaraid.com

آجاتی تھی۔ سات سو سال سے زائد بیت چکے ہیں، لیکن آج بھی فضاؤں میں ان کے پیغام محبت کی گونج باقی ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ـــ

سالہا گوش جہاں زمزمہ نا خواہد بود

زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ است

بادشاہ اور فقیر، عالم اور جاہل، صوفی اور جوگی، مرد اور عورت، ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی، شہری اور دیہاتی سب ہی نے ان کی یاد کو تازہ کر رکھا ہے اور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شہنشاہ اکبر نے اگر پاپیادہ ان کے آستانے پر حاضری دی ہے تو شاہزادی جہاں آرا نے اپنی پلکوں سے مزار کی صفائی کی ہے۔ کتنے ہی تشنگانِ معرفت ہیں جنھوں نے درگاہ کے روح پرور ماحول میں تزکیۂ باطن کا سامان تلاش کیا ہے۔ اُن عقیدت مندوں کی تو تعداد کا اندازہ بھی لگانا مشکل ہے جن کو زمانہ کی تپش اور حالات کی بے رحمی نے جب عاجز اور بے لبس کر دیا تو اس آستانے نے اپنے دامن اُن کے لئے اسی طرح کھول دئے جیسے ـــ پیاسے کو پکارے کسی دریا کا خروش۔

اس عالمگیر عقیدت اور ارادت کا راز خواجہ اجمیری رح کی وہ زندگی ہے جس کا ایک ایک لمحہ مظلوم اور بے کس انسانوں کی دردمندی میں بسر ہوتا تھا اور ان کا وہ پیغامِ محبت ہے جو انسانی سماج کو ایک برادری سمجھکر ایک رشتۂ الفت میں پرونا چاہتا تھا ـــ! ایسے محب انسانیت کی یاد سے آج بھی ہماری قومی زندگی کی گذرگاہیں روشن ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتی رح ۱۱۴۱ء کے لگ بھگ سجستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی نسبت سے سجزی کہلاتے ہیں، گو بعض لاپرواہ کاتبوں نے ایک نقطہ کو ذرا ہٹا کر لگانے سے سجزی کا سنجری بنا دیا ہے، اور اب یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے۔ ان کے والد ماجد خواجہ غیاث الدین حسن کے پاس ایک پن چکی اور ایک باغ تھا۔ خواجہ اجمیری رح کی عمر پندرہ برس کی ہوگی کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ابھی اس صدمہ سے دل نہیں ٹھہرا تھا کہ ترکان غز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کے حملوں نے سجستان میں ایک قیامت برپا کردی۔ وہاں کے شاداب اور زرخیز علاقے بنجر اور ویران ہو گئے۔ ان حالات نے خواجہ اجمیریؒ کے دل اور دماغ پر اثر کیا۔ دنیوی مال اور دولت سے یک گونہ نفرت پیدا ہو گئی اور وہ اپنی پوری جائداد کو محتاجوں میں تقسیم کر کے اس طرح اٹھ کھڑے ہوئے گویا کچھ رکھتے ہی نہ تھے۔ مولانا جامی نے سولھویں صدی کے شروع میں جب سجستان کا دورہ کیا اور وہاں ان کے حالات کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ دنیا سے دل سرد ہو جانے کا باعث ایک مجذوب ابراہیم قندوزی تھے جو ایک دن اتفاقیہ ان کے باغ میں آ نکلے تھے اور ان کی نظر کیمیا اثر نے خواجہ صاحبؒ کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔ بہر حال وطن کو خیرباد کہا تو سمرقند اور بخارا کے علمی مرکزوں نے دامن دل کو کھینچ لیا۔ کچھ عرصہ تحصیل علم میں مصروف رہے، قرآن پاک حفظ کیا اور اس زمانہ کے بعض مشاہیر علماء کی خدمت میں حاضری دی اور جو دامن دنیوی مال و متاع سے خالی کر چکے تھے اس کو علم کی دولت سے بھر لیا۔ لیکن یہ دولت بھی کسی اعلیٰ مقصد کی چاکری میں لگانی تھی چنانچہ ایک ایسے مرشد کی تلاش شروع ہوئی جو ان کی شخصیت کا رخ متعین کر سکے۔ عراق جاتے ہوئے نیشاپور کے ایک قصبہ ہرون سے گذر ہوا۔ یہاں خواجہ عثمانؒ کی بزرگی کا شہرہ کانوں تک پہنچا۔ ان کی مجلس میں حاضر ہوئے تو ایسا محسوس کیا گویا روز اول سے ان ہی کی تلاش میں میں پھر رہے تھے۔ فوراً ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے اور دن رات ان کی خدمت میں رہنے لگے۔ مرشد سفر پر جاتے تو ان کا سامان سر پر رکھ کر چلتے۔ جب کہیں قیام کرتے تو ان کے آرام و آسائش کی فکر میں لگ جاتے۔ بیس سال تک اسی طرح شب و روز ان کی خدمت کرتے رہے۔ مرشد کی اس طویل صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور ان کی ساری روحانی صلاحیتوں کو جلا مل گئی۔ اب خواجہ عثمان ہرونیؒ نے اپنے سفر بند کر دیئے، لیکن مرید کو تنہا سفر کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ خواجہ اجمیریؒ اس زمانے کے تقریباً ہر بڑے علمی اور تہذیبی مرکز میں پہنچے، اور وہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ شیخ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نجم الدین کبریٰ رح اور شیخ عبد القادر جیلانی رح سے اخذ فیض کیا، سمرقند، بخارا، بغداد، نیشاپور، تبریز، اوش، اصفہان، سبزوار، مہنہ، جرجان اور استرآباد کے علماء و مشائخ کی مجلسوں میں پہونچے۔ وہاں کے لوگوں کے فکری رجحانات اور سماجی کردار کو سمجھا اور ایک ایسے سماج کی ذہنی ابتری اور اخلاقی انتشار کا اندازہ لگایا جو چند ہی سال بعد منگولوں کے ہاتھوں تہ وبالا ہونے والا تھا۔ انسانی سیرت اور کردار کا یہ عظیم الشان معمار اب خود اپنی سیرت کی تعمیر سے فارغ ہو چکا تھا اور وقت آگیا تھا اپنی پوری صلاحیتیں کسی معاشرہ کی اصلاح میں لگادے۔ ایک روحانی اشارے نے ان کا رخ ہندوستان کی طرف پھیر دیا اور انھوں نے راجستھان کے سب سے مشہور شہر اجمیر میں ڈیرہ ڈالا۔ یہ پرتھوی راج کا عہد حکومت تھا۔ ذات پات کے امتیازات نے سماجی زندگی میں ایک ابتری اور انتشار پیدا کر رکھا تھا۔ خواجہ صاحب رح نے ... سب کو اخوت اور محبت کا پیغام سنایا۔ ایک طرف نیچی ذات کے لوگوں میں خودی اور خودداری کا جذبہ پیدا کیا تو دوسری طرف اعلیٰ ذات کے لوگوں کو اپنی انسان دوستی سے ایسا گرویدہ بنالیا کہ وہ انتہائے عقیدت میں اپنے آپ کو "حسینی برہمن" کہنے لگے۔

خواجہ اجمیری رح کی زندگی بہت سادہ لیکن انتہائی دلکش تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں پھٹی ہوئی دوتہی میں لپٹے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ دوتہی کہیں سے پھٹ جاتی تو جو کپڑا بھی میسر آجاتا اس کا پیوند لگا لیتے۔ پانچ مثقال سے زیادہ وزن کی روٹی کبھی افطار میں میسر نہ آئی۔ لیکن نظر کی تاثیر کا یہ عالم رہا کہ جس کی طرف دیکھ لیا معصیت کے سوت اس کی زندگی میں خشک ہو گئے اور وہ ان کا حلقہ بگوش بن گیا۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

لیکن اس "نگاہ کی تیغ بازی" کے پیچھے ان کا وہ دلِ دردمند تھا جو ہر مصیبت زدہ کی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خواجہ اجمیریؒ کا خیال تھا کہ انسانی سماج میں فوز وکامرانی، خوشی اور خوشحالی کا انحصا[ر]
[اسی] اس پر ہے کہ انسان برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی ہمت اور طاقت پیدا کرلے۔
[خود] ان کی زندگی اسی اصول کی آئینہ دار تھی۔ ایک شخص ایذا پہنچانے کی نیت سے چھری
[لے] کر آیا انھوں نے خندہ پیشانی سے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا اور فرمایا: "جس ارادہ
[سے] آئے ہو اس کو پورا کرو۔" یہ جملہ سننا تھا کہ اس شخص پر ایک کیفیت سی طاری
[ہو]ئی۔ چھری بغل سے نکال کر سامنے رکھ دی اور ندامت سے کہنے لگا: "آپ مجھ کو سزا
[د]یجئے۔" فرمایا: "ہم درویشوں کا مسلک یہ ہے کہ کوئی ہم سے بدی کرتا ہے تو ہم نیکی سے
[پیش] آتے ہیں تم نے تو میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔" اخلاق ومحبت کی اسی
[قو]ت نے سخت سے سخت دل کو پگھلا دیا اور جو بھی جان لینے کے لئے ان کے پاس آیا، خود
دل دے کر گیا۔

خواجہ اجمیریؒ کی روحانی تعلیم کا مرکزی نقطہ وحدت الوجود تھا۔ اس نظریہ کی فلسفیانہ
[تو]جیہ جو بھی ہو، عملی زندگی میں اس کا مطلب یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی وحدت رنگ،
[نس]ل، زبان، عقیدہ ہر چیز سے بالاتر ہے اور انسانی برادری میں جو دیواریں کھینچی
[گئی] ہیں وہ بے حقیقت ہیں۔ انسان کا پہلا رشتہ انسانیت کا رشتہ ہے۔ فرمایا
[کر]تے تھے کہ جب ہم جسمانی تعلقات سے باہر قدم رکھتے ہیں تو عالم توحید میں ساری دنیا
[ا]یک ہی نظر آتی ہے۔ وحدت انسانی کے اس تصور نے خواجہ اجمیریؒ کی تعلیم میں
[تا]ثیر اور زندگی میں تابناکی پیدا کر دی تھی۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قسط نمبر (۲۲)

ہندو تہذیب اور مسلمان

از جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

سورج اور چندر گرہن :-

البیرونی نے کتاب الھند کے باب ۵۹ میں سورج گرہن اور چندر گرہن کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے ہندو منجمین کے مطابق ماہتاب کو گرہن لگانے والا زمین کا سایہ ہے جبکہ آفتاب میں گرہن ماہتاب کی وجہ سے لگتا ہے اور لوگوں نے ازیج وغیرہ میں اپنے حسابات کی بنیاد اسی پر رکھی ہے [1]

ہندوؤں میں گہن کی پوجا کی وجہ اور منشا اور یہ کہ گہن سے متعلقہ رسمیں کیوں جاری ہیں ؟ برنیر نے ان کے عقائد کے مطابق لکھا ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے چار وید جو خدا نے ہم کو برہما کی وساطت سے عطا کئے ہیں، یہ بتلاتے ہیں کہ ایک دیوتا جس نے راک چھش کا اوتار لیا ہے اور جو نہایت فسادی، شرارت پسند اور بے حد کالا کلوٹا اور ازبس نجس اور ولندر ہے۔ سورج کو پکڑ کر بشدت میلا اور کالا بنا دیا۔ سورج بھی حالانکہ ایک دیوتا ہے مگر چونکہ وہ نہایت رحمدل اور نیک طینت ہے اس لیئے اس شریر کالی بلا کے پنجے میں پھنس کر نہایت ایذا اور تکلیف اٹھاتا ہے پس ہر شخص کے لیئے یہ لازم ہے اور واجب ہے کہ سورج بھگوان کو اس حالت سے نجات اور رہائی دلانے میں کوشش کرے اور اس کی صرف یہی سبیل ہے کہ اشنان (غسل) پوجا پاٹھ اور پن دان کرے۔ کیونکہ یہ دھرم کرم گہن کی حالت میں نہایت ہی عمدہ افعال ہیں۔ اور جو پن دان (خیرات) اس وقت کیجائے۔ وہ بہ نسبت اور پن دان کے سو گنا زیادہ پھلتا ہے۔ پس ہندو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بھلا کون ایسا شخص ہوگا جس کام میں سو گنا فائدہ ہو، نہ کرے، [2]

برنیر نے ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء میں دہلی میں سورج گہن کے موقع کا چشم دید منظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

---

[1] برائے تفصیل دیکھئے۔ کتاب الھند (ا۔ت) ۲/ص ۲۷۶-۲۹۰۔

[2] وقائع سیر و سیاحت (ا۔ت) ۲/ص ۱۵۸-۱۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"جب گہن کا وقت آیا تو میں اپنی حویلی کی چھت پر جو جمنا کے کنارے پر تھی اور جہاں سے دریا کے دونوں کنارے
ظر آتے تھے ..... جا کھڑا ہو گیا۔ ہزاروں لاکھوں ہندو کمر کمر پانی میں سورج کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑے دیکھ رہے
تھے تا کہ گہن کے شروع ہوتے ہی غوطہ لگائیں۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں اور لڑکے بالکل ننگے تھے۔ مرد صرف دھوتیاں
ندھے ہوئے تھے۔ بیاہی عورتیں اور چھ چھ سات سات برس کی لڑکیاں صرف ایک چادر یا ساڑھی اوڑھے ہوئے
یں۔ ذی مقدور شخصوں اور بڑے بڑے آدمیوں یعنی راجاؤں اور متمول اور صاحب امتیاز لوگوں نے ۔۔ جو
ربار شاہی میں معزز ہیں اور صرافوں، مہاجنوں، چودھریوں، اور بیوپاریوں وغیرہ نے یہ بندوبست کیا تھا کہ اپنے اہل
یال کے ساتھ دریا کے اس کنارے سے اُس کنارے آکر پانی میں ڈیرے اور قناتیں کھڑی کرا لیں۔ اور اسی طرح،
ردے میں اشنان کیا۔ ہندوؤں کے اس مجمع نے جونہی گہن لگتے دیکھا ایک عجیب نعرہ بلند کیا۔ اور چند بار
متواتر غوطے لگائے۔ پھر پانی میں کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ اور آنکھیں سورج کی طرف اٹھائے ہوئے بڑے حضور
لب سے عبادت اور پوجا کرتے ہوئے معلوم ہوئے اور چند بار دونوں ہاتھوں میں پانی لیکر سورج کو چڑھایا اور بہت
ب سے سر جھکا کر کبھی دائیں اور کبھی بائیں پانی دیتے تھے اور گہن کے ختم ہونے تک یہ بیچارے ایسی ہی حرکتیں کرتے
رہے اور جب جانے لگے تو جمنا میں روپے اور دونیاں اور چونیاں وغیرہ پھینکیں اور برہمنوں کو بہت کچھ پن دان
یا۔ میں نے دیکھا کہ ہر ایک شخص نے جب پانی سے باہر نکلا نئی پوشاک جو دریا کے کنارے ریت پر پہننے کو رکھی،
تھی، زیب تن کی، بلکہ بہت سے لوگوں نے جو زیادہ دھرم آتما تھے اپنی پرانی پوشاکیں برہمنوں کو پن میں دیدیں[1]

اور جیسا یہاں ہوا تھا ویسا ہی دریائے سندھ اور گنگا اور ہندوؤں کے اور دریاؤں بلکہ عام تالابوں پر بھی ہوا
تھا۔ کہتے ہیں کہ تھانیسر میں قریب ڈیڑھ لاکھ آدمی ہندوستان کے ہر ایک حصہ سے اشنان کے واسطے آکر جمع ہوئے
تھے کیونکہ اس ندی کا پانی گہن کے دن اور دریاؤں اور ندیوں کی نسبت زیادہ متبرک اور پاک سمجھا جاتا تھا[2]

تاریخ کی کسی کتاب سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مسلمانوں میں سورج اور چندر گرہن کے موقعوں پر ہندوؤں کے
سومات بجالانے اور متعلقہ اوہام پر عمل کرنے کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور کب ہوئی؟ اس سلسلے میں بھی قیاس چاہتا

FERRY: P.324. W. CROOK. PP. 11-12. CAVERI/ [1] وقائع سیر و سیاحت ۲/ص ۱۵۶-۱۵۷ انیز/
[2] وقائع سیر و سیاحت ۲/ص ۱۵۷ PART. III, PP. 263. 64

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ ہندی الاصل لوگوں نے جب اسلام قبول کیا تو مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے اپنی قدیمی آبائی رسموں کو ترک نہیں کیا۔ بلکہ انکو اسلامی رنگ دیکر جاری رکھا۔ ہندو دیگر رسموں کی طرح اس موقعہ کی رسمیں بھی جاری رہیں اور رفتہ رفتہ انکو مذہبی اہمیت حاصل ہو گئی۔ بدیں وجہ اہلیہ میر حسن علی کے ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے انیسویں صدی کے پہلے ربع اول میں ذاتی مشاہدہ کی بنا پر دیئے تھے لہ کہ اس عہد میں ہندو اور مسلمان دونوں گرہن کے شروع ہونے کا اعلان بلند نعروں سے کرتے تھے۔ بالعموم مسلمان اس وقت تک عبادت کرتے روزہ رکھتے جب تک گہن ختم نہ ہو جاتا تھا لہ اس موقع کی رسموں کے بارے میں اہلیہ میر حسن علی لکھتی ہیں:-

"غرباء و مساکین میں عورتیں غلہ روپیہ پیسہ اور تیل بطور صدقہ اور خیرات تقسیم کرتی ہیں۔ شرفا اہل تعلقہ حاجتمندوں کو انعام دیتے ہیں اور اس منجم کو، جو بادشاہ یا نواب کو گہن شروع ہونے کا صحیح وقت بتاتا ہے۔ گہن ختم ہونے کے بعد روپیہ، لباس اور خالص طلا کا چاند انعام میں دیتے جاتے ہیں ایک منگیتر اپنے ہونے والے شوہر کے صدقہ میں ایک بکری یا بکری کا بچہ بھیجتی ہے جس کو دوران گہن میں اس کی چارپائی کے پائے سے باندھا رکھا جاتا ہے۔ بعد ازاں ان صدقات کو از راہ خیرات تقسیم کر دیا جاتا ہے سے۔"

حاملہ عورتوں اور جانوروں کی حفاظت کے لیے بھی کچھ رسمیں ادا کی جاتی تھیں ۔۔۔ اہلیہ میر حسن علی رقمطراز ہیں

"ان کا خیال تھا کہ بطن کے بچے کا تحفظ ماں کو خواب سے باز رکھنے پر منحصر ہے۔ اس وجہ سے دوران گہن میں حاملہ عورت کو سونے نہیں دیا جاتا تھا اور اسے بیدار رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ دوران گہن میں اسے چاقو، قینچی، اور یا کوئی دوسرا اوزار استعمال کرنے کی اجازت اس خوف و ڈر کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی کہ اسوقت خون کا نکلنا بچہ اور ماں دونوں کے لئے مضر رساں ثابت ہوگا۔ ایسی صورت میں جانور تک کو نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ ایسے جانوروں کو چاہے وہ گائیں، بکریاں یا بھیڑیں ہی کیوں نہ ہوں، پیٹ پر گوبر اور دوسری اشیاء کو آمیزش کر کے ملا جاتا تھا لہ"

لہ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ OED-FRAYER:TRAWCLR/ لہ OBSERVATIONS.ETC.I.P.۲۹۶

لہ OBSERVATIONS.ETC.I.P.۲۹ لہ ایضاً ص ۲۹۷-۲۹۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بت پرستی

ابتدائے تہذیب سے عوام کا رجحان بت پرستی کی طرف رہا ہے۔ البیرونی نے بت پرستی کے رجحانات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔

"عوام کی طبیعتیں محسوس کی طرف میلان رکھتی اور معقول سے گریز کرتی ہیں جس کو صرف علماء جانتے ہیں۔ جو ہر زمانہ میں اور ہر جگہ کم ہوتے ہیں چونکہ مثال سے عوام کی طبیعت کو ایک طرح کی تسکین ہوتی ہے لہٰذا اکثر مذاہب والے کتابوں اور عبادت گاہوں میں تصویر بنانے کی طرف مائل ہو گئے جیسے یہود و نصاریٰ اور خصوصیت کے ساتھ منانیہ۔ اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر تم کسی نامی کو یا خوشی سے اس میں تصویر۔ چومنے اور اس کو اپنے رخساروں سے لگانے اور عجز و نیاز ظاہر کرنے کے ایسے آثار پیدا ہو جائیں گے کہ گویا اس نے خود اس کو دیکھا جس کی تصویر ہے اور اس ذریعہ سے حج اور عمرہ کے مناسک ادا کئے۔ یہی وجہ ہوئی کہ جن لوگوں کی تعظیم کیجاتی ہے۔ مثلاً انبیاء۔ اولیاء اور فرشتے، انکے نام کا بت یا مجسمہ بنا لیا گیا تاکہ نظر سے غائب رہنے اور موت کی حالت میں ان کے حکم کو یاد دلاتا رہے اور دلوں میں مرتے دم تک ان کی تعظیم کا اثر باقی رہے۔ یہاں تک کہ انکے بنانے والوں کا زمانہ بہت دور ہو گیا اور انہیں سینکڑوں اور ہزاروں سال گذر گئے۔ ان کے اسباب و محرکات کا پتہ نہیں رہا اور صرف رسم و رواج کی حیثیت سے ان پر عمل رہ گیا۔ پھر اہل قانون اس دروازے سے ان پر داخل ہوئے۔ یعنی قانون و حکمت کو بتوں کے نام کے ذریعے لوگوں میں رواج دیا۔ اور چونکہ اس کا اثر لوگوں پر قوی ہوتا ہے بت پرستی کو ان پر واجب کر دیا[۱]

اسلام سے قبل عربوں میں بھی مظہر پرستی کا عام رواج تھا۔ اور عبادت کا مقصد انکے وسیلے سے خدا کی قربت حاصل کرنا تھا[۲] اسلام نے بت پرستی کا مسلام اور قلع قمع کر دیا اور اس عمل کو کفر قرار دیدیا۔

ہندوستان میں قدیم الایام سے مظہر پرستی مروج تھی اور اب بھی ہے[۳] مگر دوسری رسموں کی طرح سے ہندوستانی مسلمانوں میں بت پرستی کا رجحان پایا جاتا تھا اور ہندوؤں کے بتوں کی وہ لوگ بھی اسی طرح پرستش کرتے تھے۔ نذر چڑھاتے تھے۔ جس طرح دوسرے ہندو سجان رائے بھنڈاری کا ذیل بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس سے یہ بات بالکل غیر مشتبہ طور سے ثابت ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں میں بھی قبر پرستی کے علاوہ دیوی

---

[۱] البیرونی: کتاب الھند ا/ص ۱۴۳-۱۴۴ [۲] البیرونی کتاب الھند ا/ص ۱۶۰- [۳] ایضاً ص ا/ص ۴۴

© rasailojaraid.com